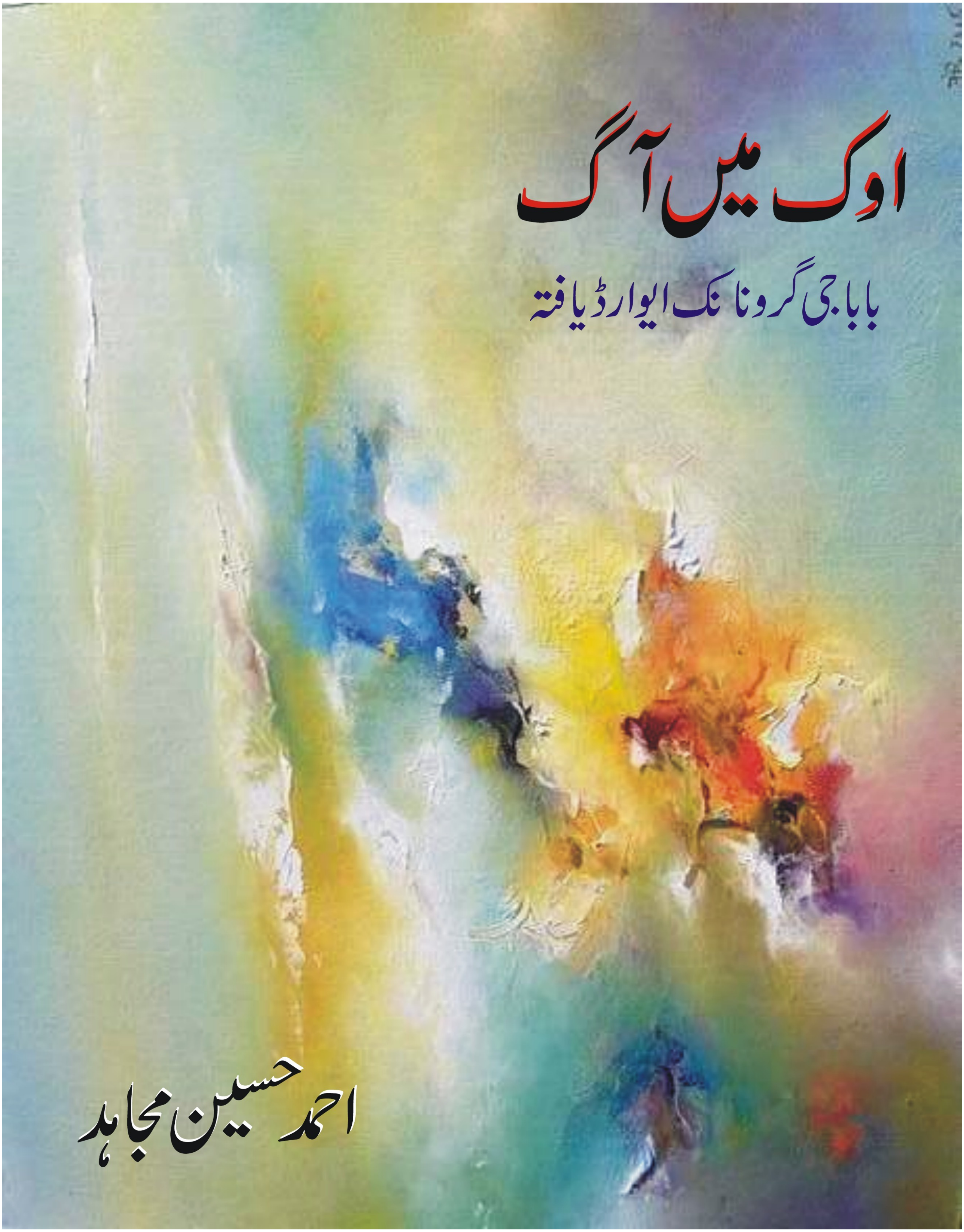


اوِک میں آگ

بابا جی گرونانک ایوارڈ یافتہ

احمد حسین مجاہد

میں نے آپ کا نیا مجموعہ ''اوک میں آگ'' پڑھا۔کمال شاعری ہے،سبحان اللہ،سبحان اللہ۔۔۔!میں پہلے آپ کا فین تھا اب مرید ہو گیا ہوں۔80 کی دہائی کے یکسانیت زدہ شاعروں میں آپ نے غزل کے اسلوب اور باطن میں تبدیلی اور پیش رفت کی ہے۔

عباس تابش

خیبر پختونخوا میں اب تک مجھے جو شاعر مکمل طور پر پسند تھے وہ فرازؔ،قاصرؔاور مقبول عامر تھے۔جزوی طور پر اچھا لگنے والوں کی فہرست لمبی ہے لیکن ''اوک میں آگ'' پڑھنے کے بعد مجھے چوتھے شاعر کا سراغ مل گیا ہے۔.

''دھند میں لپٹے جنگل'' میں سفر کرنے والے کی ''اوک میں آگ'' امید کی بجھتی مشعل کو تابندہ کر رہی ہے۔اردو غزل و نظم کو نوید ہو کہ صوبۂ سرحد چاہے نام کی حد تک پختون خوا ہو گیا لیکن اردو شعر سے اس کا رشتہ بحال ہے اور یہاں سے مین سٹریم میں آنے والی چوتھی مضبوط اور توانا لہر کا نام احمد حسین مجاہد ہے۔

شہاب صفدر

اوک میں آگ

بابا جی گرونانک ایوارڈ یافتہ

احمد حسین مجاہد

جملہ حقوق بحق
مشیت شناس خان، مخضر احمد خان اور طینت غنا خان محفوظ ہیں۔

کتاب:	اوک میں آگ
شاعر:	احمد حسین مجاہد
اشاعتِ اول:	جنوری ۲۰۱۴
ای ایڈیشن:	مارچ ۲۰۲۲
سرورق:	وجدان
قیمت:	سات سو روپے

اہتمام پبلشرز۔ ایبٹ آباد

رابطہ: 0332-9461234
ای میل: mashiats@gmail.com

عالیہ احمد کے نام

جھونکے ہَوا کے مجھ سے مہک مانگتے پھریں
ایسا کوئی شگوفہ سرِ شاخسار دے
بھر دے مرا وجود محبت کے نُور سے
مجھ کو زمیں کا عجز، فلک کا وقار دے

ترتیب

دیباچہ

اس وقت اردو میں اخباری کالموں کے بعد سب سے زیادہ جو لکھا جا رہا ہے، وہ شاعری ہے۔ کبھی کبھی تو گمان گزرتا ہے کہ جیسے ہر دوسرا شخص شاعر ہے، مگر شاعری کے نام سے سامنے آنے والی الم غلم تحریروں میں سے حقیقی اور معیاری شاعری کو چھانٹنا کارِ فرہاد لگتا ہے۔ اگرچہ شاعری کے معیار کا تصور اضافی ہے؛ یعنی جو کچھ آپ کے لیے بلند مرتبہ ہے، وہی کسی دوسرے کے لیے غیر اہم ہوسکتا ہے، اور دونوں کے پاس اپنی اپنی رائے کے حق میں دلائل بھی ہو سکتے ہیں، تاہم 'حقیقی اور معیاری شاعری' سے متعلق کچھ بنیادی اصول بہ ہر حال غیر مشتبہ ہیں۔ جیسے زبان کی تازگی۔

اگر کسی شاعر کی لفظیات تازہ، کلیشے سے پاک ہیں تو کتنی ہی دوسری خوبیاں اسی کے نتیجے میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ خیال ہو یا احساس، زبان کے بغیر اپنی موجودگی باور نہیں کرا سکتے؛ لہٰذا زبان تازہ اور نئی ہوگی تو خیال اور احساس بھی شاعر کے انفرادی، غیر تقلیدی شعری تجربے کے گواہ ہوں گے۔ وہ دوسروں کے مضامین کی نقالی یا جگالی کے بجائے، نئے مضامین خلق کرے گا۔ نئے مضمون کی تلاش وسیع معنوں میں، دنیا، سماج، کائنات اور خود سے نئے رشتوں کی دریافت سے عبارت ہے۔ اگر کسی شاعر کے یہاں محبت، اجنبیت، تنہائی، سماج، فرد، کائنات کے باب میں کوئی نیا مضمون پیش ہوا ہے، تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ ان کے سلسلے میں کوئی نیا تجربہ، ادراک یا کشف شاعر کو ہوا ہے۔

اس تناظر میں معاصر اردو شعرا کے ازدحام میں چند شعرا ہی ہمیں متوجہ کرتے ہیں، اور انھی میں ایک اہم نام احمد حسین مجاہد کا ہے۔ ان کا کلام گزشتہ تین دہائیوں سے اردو کے ممتاز ادبی جرائد میں باقاعدگی سے شایع ہو رہا ہے، اس لیے اردو ادب کے سنجیدہ قارئین ان کی شاعری کے رنگِ خاص کی پہچان رکھتے ہیں۔ وہ ہزارہ میں مقیم ہیں اور ملک کے بڑے شہروں کی ادبی مجالس اور وہاں کے مشاعروں سے دور رہتے ہیں، مگر اس ''دوری'' کے باوجود وہ جدید اردو

شاعری کی حسیت وشعریات سے نہ صرف پوری طرح وابستہ ہیں بلکہ ان کے ضمن میں ایک اپنا موقف بھی رکھتے ہیں۔ یوں بھی نئے برقی ذرائع ابلاغ سے وجود میں آنے والی عالم گیریت نے چھوٹے بڑے شہروں کی ادبی روایت میں فرق خاصا کم کردیا ہے۔ بایں ہمہ مقامیت کچھ نہ کچھ اثر شاعری پر ضرور مرتب کرتی ہے ۔ مثلاً احمد حسین مجاہد کی شاعری میں ہزارہ کا کوہستانی لینڈ سکیپ ظاہر ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ اسی رسمیاتِ شعر کے تحت ظاہر ہوا ہے، جو نئی غزل کا امتیاز ہے۔ نیز یہ واضح رہے کہ کوئی تخلیق کار اپنے عصر اور اس کی حاوی شعریات کے باب میں اپنا موقف رکھے بغیر اپنے دستخط ثبت نہیں کرسکتا۔ یہ بات احمد حسین مجاہد کے شاعرانہ ادراک میں پوری طرح روشن نظر آتی ہے۔

اوك میں آگ مجاہد کا تازہ شعری مجموعہ ہے۔ اس میں زیادہ تعداد غزلوں کی ہے اور چند ایک نظمیں شامل ہیں۔ (میں صرف غزلوں پر توجہ مرکوز رکھوں گا، اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ مربوط گفتگو کی جا سکے)۔ مجاہد نے زیرِ نظر مجموعے کا نام اسی میں شامل غزل کے ایک شعر سے اخذ کیا ہے۔

کتاب کا نام ایک طرح سے، کتاب کے مشمولات کی جہتِ خاص کی نمائندگی کرتا ہے۔ کتاب ایک تنوع کی حامل ہوتی ہے، اس کا نام اس تنوع کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ نام کسی کتاب کی دنیا میں داخل ہونے کا دروازہ ہوتا ہے۔ بلاشبہ ایک اچھی کتاب کی دنیا میں داخل ہونے کے کئی ظاہر اور خفی دروازے ہوتے ہیں۔ نام محض ایک دروازہ ہے۔ اگر مصنف اناڑی ہو یا اپنے ہی کام کے سلسلے میں بے پروا ہو تو کتاب کا نام دروازہ نہیں، سدِ راہ ہوسکتا ہے۔ مجاہد نے سوچ بچار کے بعد ایک خاص نام کا انتخاب کیا ہے؛ کئی ممکنات میں سے ایک ممکن کو زیادہ اہمیت دی ہے اور اس کا سبب اس شعر کے مطالعے سے سمجھ میں آجاتا ہے، جس کے دوسرے مصرعے میں اوک میں آگ کی ترکیب موجود ہے۔

میں مسافر تھا طلب کرتا اگر آبِ حیات
اوک میں بھر کے مجھے آگ پلائی ہوتی
لے گیا کوئی رسالت ،کوئی اعجازِ ہُنر
میں نے اے کاش ! اگر آگ ہی لائی ہوتی

مندرجہ بالا پہلے شعر کے تمام کلیدی الفاظ استعاراتی سطح اختیار کر گئے ہیں: میں، مسافر، طلب، آب حیات، آگ ایک ایسی علامتی فضا کے حامل ہو گئے ہیں، جو بیک وقت شعر کی ''داخلی دنیا'' اور شعر سے ''باہر کی دنیا'' سے منسلک ہے۔ شعر کے باہر کی دنیا میں خود اس کتاب کے دیگر اشعار اور باہر کی سماجی صورتِ حال، دونوں شامل ہیں۔ شعر کے متکلم کا روئے سخن اپنے ''نامعلوم'' مخاطب کی طرف ہے اور اس کے تکلم میں اس کے مسافر ہونے کی پہچان پر اصرار موجود ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ مفہوم پیش کرنے کے لیے آبِ حیات اور آگ کی علامتیں کیوں لائی گئی ہیں؟ کیا فقط روایتی طور پر آب کی ضد مخالف آگ لائی گئی ہے؟ اور یہ روایتی طریقہ ہماری غزل میں کثرت سے موجود ہے۔ اکثر اوقات یہ جدلیاتی طریقہ کسی نئے خیال یا نئی بصیرت کی یافت کے تابع نہیں ہوتا، بلکہ محض ایک معنیاتی یعنی Semantic انداز ہوتا ہے۔ اس شعر کو اگر اس طرز کا ایک عام شعر سمجھیں تو پھر اس پر توجہ کی سرے سے ضرورت ہی نہیں۔ چوں کہ آگ اور اس کے متعلقات مجاہد کے یہاں کثرت سے ہیں اور ان کا معنوی ربط اس شعر میں ظاہر ہونے والے ''آگ'' کے علامتی مفہوم سے ہے، اس لیے یہاں آبِ حیات اور آگ روایتی تضاد کے حامل نہیں....ایک سطح پر تو شعر میں طنز ہے کہ متکلم اگر ہمیشہ کی زندگی کی طلب کرتا تو اسے آگ کے سپرد کر دیا جاتا، مگر دوسری سطح پر آگ، آبِ حیات کو معنوی سطح پر بے دخل یعنی Displace کر رہی ہے اور خالی ہونے والی جگہ کو ایک خاص مفہوم سے بھر رہی ہے۔ یہ خاص مفہوم آبِ حیات کے معنی کا مثنیٰ نہیں، ایک ارفع سطح کا متبادل ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہاں آگ، آبِ حیات کی طرح ابدی زندگی بخشنے کا مفہوم پیش نہیں کر رہی، بلکہ ایک نئی حیات تخلیق کرنے کا معنی رکھتی ہے۔ آگ کا یہ معنی، اس سفر کے تناظر میں قائم ہوتا ہے جو اس شعر کے متکلم کو درپیش ہے۔ یہ سفر ایک ایسی زندگی کی تمنا سے عبارت نہیں، جو نامختتم ہو۔ آبِ حیات اپنی روایتی معنویت میں جس ابدی زندگی کی ضمانت دیتا ہے، وہ دراصل ایک ہی طرز و نوع کی زندگی کا تسلسل ہے، جب کہ آگ ایک طرز کی زندگی کا خاتمہ کرتی ہے تا کہ ایک نئی طرز کی زندگی کا آغاز ہو سکے۔ پانی میں محض بقا ہے تو آگ میں تخلیقی تازگی کا بیش از بیش امکان ہے۔ مزید یہ کہ آگ میں حرارت اور روشنی بھی ہے۔ اسی معنویت کا چراغ مندرجہ بالا دوسرے شعر میں بھی روشن ہے۔ گویا آگ کے علامتی معنی کے سرے احمد حسین مجاہد کی غزل کے دوسرے متعدد اشعار میں ملتے ہیں۔

مندرجہ بالا دوسرے شعر کے پس منظر میں یونان کی ایک مشہور اسطورہ موجود ہے: پرومیتھیس کی اسطورہ۔ پرومیتھیس نے انسانوں کے لیے زیوس سے آگ چرائی تھی۔ زیوس ''دیوتاؤں اور انسانوں کا بادشاہ'' تھا، اس لیے آسمانوں میں رہتا تھا۔ پرومیتھیس زمین کے باسی انسانوں کے لیے آگ چرا کے لایا تھا۔ زیوس نے پرومیتھیس کی جسارت اور آگ دونوں کو اپنی بادشاہت اور اقتدار کے لیے چیلنج سمجھا۔ پرومیتھیس کا جرم ناقابلِ معافی تھا۔ لہٰذا اسے ایک چٹان سے باندھ دیا گیا، جہاں ہر روز ایک عقاب اس کے جگر کا کچھ حصہ چبا جاتا ہے۔ رات کو جگر کا کھایا ہوا حصہ اگ آتا ہے۔ عقاب پھر اس پر اپنے دندانِ آز آزماتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اسے محض دیوتاؤں کی دنیا کے ایک اصول کو توڑنے کی غلطی کی سزا نہیں ملی، انسانوں کے لیے آگ لانے کے جرم کی کڑی سزا ملی۔ لہٰذا اس اسطورہ میں انسانوں کے لیے آگ کی اہمیت اور معنویت ظاہر ہوتی ہے۔ انسانوں کی آگ، آسمانی دیوتا کی حریف بنتی ہے؛ آگ آسمانی دیوتا کی قوتِ تخلیق کی علامت ہے، پرومیتھیس نے انسانوں کو اس قوت میں شریک ٹھہرایا۔ دوسرے شعر کا متکلم پرومیتھیس کے کردار کی آرزو کرتا ہے۔ ایک شعر میں آگ پینے کی خواہش اگر ہے تو دوسرے شعر میں آگ لانے کی۔ ایک جگہ اوک میں بھری آگ پینے کی آرزو ہے اور دوسرے مقام پر آگ ایک نئے نظام حیات کی علامت ہے۔

آب حیات کی طرح آگ پی کر نئی طرز کی زندگی پانا، انفرادی خواہش ہے، مگر پرومتھیس کی طرح آگ لانا پوری نوع کے باطن کو روشن کرنے اور زندہ رکھنے کی وہ خواہش ہے جو صرف اعلیٰ ترین شعور ہی کرتا ہے، یعنی تخلیقی شعور۔ اسی شعر کی گہری ساخت میں آگ اور رسالت کے نیم تاریخی، اساطیری تعلق کی طرف اشارہ بھی موجود ہے۔ مگر اس ضمن میں اہم بات یہ ہے کہ شاعر انتہائی خفی انداز میں پرومیتھیس اور موسیٰ کے آگ سے تعلق کا موازنہ کرتا ہے: اوّل الذکر کو آگ لانے کی بنا پر دیوتاؤں کی ناراضی کا سامنا کرنا پڑا، مگر، موسیٰ کو آگ کی صورت خدا کی رضا حاصل ہوئی۔ شعر کا متکلم پرومیتھیس کے کردار کی آرزو کرتا ہے، شاید اس لیے کہ نئے زمانے کے دیوتا بھی، نئی قسم کی تاریک غاروں میں قید انسانوں تک روشنی نہیں پہنچنے دیتے؛ نیز پرومیتھیس، پیغمبر کے برعکس باور کراتا ہے کہ روشنی اچانک، اتفاقاً نہیں ملتی، اسے 'حاصل' کرنا پڑتا ہے، اور کوئی انسانی سعی ایسی نہیں جو کسی شے کے حصول کے لیے کسی اور شے کو حریف نہ بنائے، یا اس سعی کی زد

پر کچھ اور نہ آئے۔ طاقت و تقدیر سے لے کر فطرت و سماج کچھ بھی انسانی سعی کی زد پر آ سکتا ہے۔
اسی بات کو مجاہد نے ایک اور شعر میں پیش کیا ہے۔

نظمِ فطرت میں یہ بیکار تجسس میرا
کسی لمحے خلل انداز بھی ہو سکتا ہے

پرومیتھیس کی اسطورہ ان کے ایک اور شعر کے معنی کی بافت میں بھی شریک ہے۔ بہ ظاہر تو یوں لگتا ہے کہ پہلے شعر میں جس تمنا اور حسرت کا ذکر تھا، وہ اس شعر میں تجربہ بن گئی ہے، مگر اصل یہ ہے کہ شاعر ذاتی تجربے کی 'واقعیت' سے آگ کی تخلیقی معنویت باور کرانا چاہتا ہے۔

مگر وُہ ہم تھے کہ لائے تھے اُس الاؤ سے آگ
وہاں سے راکھ تو اَب کوئی جا کے لے آئے

اس شعر میں 'ہم' یعنی جمع متکلم کا صیغہ ہے جو واحد کا مفہوم بھی دیتا ہے اور یہ مفہوم ایک گونہ تفاخر اور تعلّی لیے ہوتا ہے۔ اس شعر میں بھی گو ایک تعلّی موجود ہے، مگر یہ تو اس شعر کی بالائی پرت سے مترشح ہونے والا مفہوم ہے۔ شعر کی زیریں سطح میں مضمر دوسرے معانی ہیں۔ ایک تو اس بات پر اصرار موجود ہے کہ ''اس الاؤ کی آگ'' ہی نہیں، راکھ بھی معنویت رکھتی ہے۔ دوسرا یہ مفہوم بھی ہے کہ جب ہم گئے تھے تو وہاں آگ تھی اور ہم اسے لائے تھے، مگر اب وہاں فقط راکھ ہے۔ آگ کے مقابلے میں راکھ لانا آسان ہے۔ یہ آسان کام تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔ کوئی کر کے دکھائے نا! علاوہ ازیں 'ہم' کا صیغہ تخلیق کاروں کی پوری نوع کی نمائندگی کر رہا ہے۔

مجاہد کی شاعری کی ایک اور توجہ طلب خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی شعری علامتوں کے نئے نئے معنیاتی علاقے دریافت کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ نئے معانی ان معانی کی توسیع نہیں ہیں، جن کا ابھی ذکر ہوا ہے: وہ آگ کو کچھ اور علامتی معانی میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ وہ اپنی شاعری کو چند واضح اور بیّن تصورات کی ترسیل کا ذریعہ بنانا نہیں چاہتے۔ پرانی اصطلاح میں وہ غیر وابستہ رہنا چاہتے ہیں۔ واضح رہے کہ غیر وابستگی، ایک گونہ لاتعلقی، ایک قسم کی اجنبیت نہیں ہے۔ آدمی کے جب تک حواس اور اظہار کی صلاحیت سلامت ہے، وہ لاتعلق نہیں ہو سکتا۔ تاہم اس بات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم تعلق کی مختلف و متنوع صورتوں اور سطحوں کا تصور کرنے کے قابل ہوں۔ لہٰذا غیر وابستگی، ایک وسیع

مفہوم کی حامل وابستگی ہے۔'وابستہ شاعر' زندگی کے ایک مفہوم، تجربے کی ایک قسم کو سینے سے لگاتا ہے، جب کہ 'غیر وابستہ' خود کو ایک مفہوم وقسم کا پابند نہیں بناتا؛ وہ زندگی سے غیر مشروط طور پر وابستہ رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں متضاد، متنوع، کثیر مضامین پیش ہوتے ہیں۔

احمد حسین مجاہد کی غیر وابستگی انھیں فرد، مقامی سماج، عالمی دنیا، لمحہء حال، ماضی، صنفی امتیازات سے متعلق شعر کہنے پر اکساتی ہے۔ دگرگوں سماجی اور عالمی صورتِ حال کا شعری بیان ان کے یہاں موجود ہے، اور اپنے مخصوص علامتی انداز میں۔ ان اشعار کا لہجہ، دل دردمند کی پکار ہے۔ یوں بھی ظلم، ناانصافی، استحصال کے ادراک اور اس پر طنز واحتجاج کے لیے پہلے کسی فلسفے کا حامل ہونا ضروری نہیں۔ مثلاً یہ دو شعر دیکھیے جن میں معاصر عالمی استعمار اور مقامی صورتِ حال کی طرف اشارے ہیں۔

ہَم اور آپ تَو ہیں دَشتِ نینوا میں ابھی
کہ خیمہ زَن ہے عدو اَرضِ انبیا میں ابھی

تلوار عدو کی تھک گئی ہے
پھر فصل سَروں کی پک گئی ہے

جن اشعار میں مجاہد نے آگ کو نئے اور مختلف مفاہیم میں پیش کیا ہے، ان سے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان اشعار میں انھوں نے یہ باور کرایا ہے کہ شاعر لفظوں کو الٹتا پلٹتا رہتا ہے، جیسے کوزہ گر مٹی کو الٹ پلٹ کر نئی نئی صورتیں ڈھالتا ہے۔ شاعر کے نزدیک لفظ ایک زندہ وجود ہوتا ہے؛ دھڑکتا، سانس لیتا ہوا اور اپنی گرمیِ وجود سے نئی نئی کیفیتیں پیدا کرتا ہوا۔ لفظوں کو الٹنے پلٹنے کا عمل کبھی تو کسی ایسی بصیرت یا تجربے کے اظہار کی خاطر ہوتا ہے جس کے لیے رائج زبان ناکافی نظر آتی ہے اور کبھی یہ ظاہر کرنے کے لیے شاعر لفظوں کے نئے نئے اطراف سامنے لاتا ہے، کہ یہ دریافت کیا جائے کہ لفظ کے اندر کی دنیا میں کس قدر گنجائشیں ہوتی ہیں۔ لفظ کے اندر کی صغیری کائنات میں سفر اور اس کے معنوی امکانات کی تلاش، لفظ کے متعلقات کی مدد سے ممکن ہوتی ہے یا نئے سیاق میں لفظ کو برتنے کی صورت میں۔ مجاہد کے یہاں دوسری صورت نسبتاً زیادہ ہے۔

اب کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے جن میں انھوں نے آگ اور اس کے متعلقات،یعنی دیا، چراغ،سورج وغیرہ کو دیگر سیاق میں استعمال کیا ہے اور نئے نئے معانی کی جوت جگائی ہے۔ان اشعار میں بعض جگہ تو انسانی تعلقات کی بعض کڑوی سچائیوں کو پیش کیا گیا ہے اور کہیں وجودی تنہائی کا تجربہ پیش ہوا ہے اور کسی جگہ معنی آفرینی کی گئی ہے،یعنی لفظ کی باطنی معنوی دنیا کو الٹ پلٹ کر دیکھا گیا ہے۔تاہم زیادہ تر ان کی شاعری میں غیر نمائندگی پذیر خیال آفرینی کی جگہ نمائندگی پذیری ہے۔

کسی نے آگ میں گوندھا ہے برسوں میری مٹی کو
بدن کے ریشے ریشے میں اِک آئینہ چمکتا ہے

بے درد ! طلوع ہَو کہیں سے
اَب آگ بہت بھڑک گئی ہے

بَس اِک دیے کے سوا گھر میں کچھ نہ تھا احمد
اُسے بھی سامنے ہَم خود ہَوا کے لے آئے

میں اپنے لرزتے ہُوئے سائے کی لحد ہُوں
دَم آنکھوں میں اَٹکا ہے چراغ ِ سحری کا

آپ نے ملاحظہ کیا کہ شاعر نے ایک 'آگ' کے مضمون کو کس قدر وسعت دی ہے۔وہ اس کے تلازمات سے کیا کیا شاعرانہ کمالات دکھاتے ہیں،اس کی ایک مثال مندرجہ بالا دوسرا شعر ہے۔مضمون کی سطح پر یہ شعر نیا نہیں،مگر اسے جس لہجے اور جن لفظیاتی متعلقات کی مدد سے پیش کیا گیا ہے،وہ دادطلب ہے۔ مجاہد کی غزل کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سادہ،عام فہم لفظوں کو علامتی سطح تفویض کر کے انھیں گہرے معانی کا حامل بنا دیتے ہیں۔اس سے ان کی غزل نہ تو اس ابہام کا شکار ہوتی ہے ،جس کی شکایت جدید غزل سے اکثر قارئین کو رہی ہے اور نہ اس کی غنائیت متاثر ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات اہم نہیں کہ مجاہد کے اشعار سے نمو کرنے والے معانی کی نوعیت کیا ہے،

اہم بات یہ ہے کہ وہ کس طور اپنے اشعار میں معنی سازی کے ایک ایسے ملکے کی نمود کرتے ہیں، جس میں ایک طرف نشاطیہ آہنگ ہے، اور دوسری طرف اپنے قاری کو متوجہ کرنے اور معنی وضع کرنے پر اکسانے کا رویہ ہے۔

حق یہ ہے کہ اس مجموعے میں کئی طرح کے مضامین پیش ہوئے ہیں، ان سب کے تعارف کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ میں اس کتاب پر کوئی اکیڈمک قسم کا مضمون لکھنے کا ارادہ نہیں رکھتا، میرا مقصود تو اس کتاب کی روح کو سمجھنا ہے۔ یعنی مجاہد کی غزل جس شعریات سے طلوع کرتی ہے، اسکے اہم پہلوؤں کو دریافت کرنا چاہتا ہوں۔

ان کی غزل کی شعریات کا ایک اور اہم پہلو، جو ان کے مضامین کی شیرازہ بندی کرتا ہے، وہ ہے، ان کے متکلم کا موقف۔ ان کی غزل جس متکلم، میں یا موضوع انسانی (Subject) کا تصور ابھارتی ہے، وہ دنیا، سماج اور ذات کو محض ایک تماشائی کے طور پر نہیں دیکھتا۔ اصل یہ ہے کہ دنیا کے ادراک میں اپنی نفی کرنا، ان کے متکلم کو پسند نہیں۔ (اگرچہ دنیا سے علیحدگی، اور اپنی نفی ایک دھوکے سے زیادہ نہیں، مگر نفیِ ذات کا نعرہ یا ڈسکورس دنیا کا مختلف تصور ضرور پیش کرتا ہے)۔ اپنی نفی کے دعوے کا مطلب، دنیا وسماج میں اپنے اثبات، اور اپنے کردار سے گریز ہے۔ ان کی غزل میں جہاں جہاں متکلم ظاہر ہوتا ہے، وہاں وہ کسی نہ کسی رنگ میں اپنا اثبات کرتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ یہ اثبات کوئی نعرہ نہیں، بس دنیا کو اپنی نظر سے دیکھنے سے عبارت ہے۔

اس کا اثر ان کی غزل پر یہ پڑا ہے کہ ایک قسم کی وسعتِ نگاہ پیدا ہوگئی ہے۔ جب ان کا متکلم دنیا کو اپنی نظر سے دیکھتا ہے تو تخیلی طور پر ایک مقامِ بلند سے دنیا پر نظر ڈالتا ہے۔ بلندی سے نہ صرف ایک وسیع منظر دیکھا جا سکتا ہے، بلکہ اس منظر میں لازماً ایک پیٹرن بھی رونما ہو جاتا ہے۔ اس پیٹرن کا دوسرا نام، مختلف اشیا کا وہ باہمی ربط ہے، جسے متکلم کی نظر نے 'پیدا' کیا ہے۔ لہٰذا متکلم صرف دنیا کو نہیں دیکھتا، اپنی نظر کے کرشمے بھی ملاحظہ کرتا ہے۔ یہ اشعار دیکھیے:

پہاڑ اپنی جگہ سے سرک گیا احمد
پہاڑ پر نظر آیا تھا راستہ مجھ کو

سراغ پائے گا میرا وہ میری موت کے بعد
بھٹک رہی ہے مری روشنی خلا میں ابھی

ہم آسمان سر پہ اٹھائے ہوئے تو ہیں

جائیں کہاں زمین پہ آئے ہوئے تو ہیں
اگرچہ یہ مری کوشش کی انتہا بھی نہ تھی
وہاں چراغ جلایا جہاں ہَوا بھی نہ تھی
کس کے مخبر ہیں عناصر، پسِ افلاک ہے کون
بھید یہ کھول دے، ایسا مرا ادراک ہے کون

ان سب اشعار میں جو نیم فلسفیانہ، مفکرانہ جہت اظہار پاتی ہے، اس کا باعث متکلم کی اثباتِ ذات ہی کی خواہش ہے۔ اثبات دوسروں سے، دوسروں کے درمیان، اور دوسروں کے مقابل ہوتا ہے، اس لیے متکلم دوسروں سے مختلف زاویہ نگاہ، موقف یا پوزیشن اختیار کرتا ہے۔'دوسروں' میں لوگ، فطرت سب شامل ہے۔ اوپر درج اشعار میں پہلا شعر اگرچہ اکتوبر دو ہزار پانچ کے تباہ کن زلزلے کی واقعیت کی طرف ہماری توجہ مبذول کرتا ہے، مگر شعر کا متکلم محض اس واقعہ کی نقش گری کرنے کے بجائے، اور اس کی بربادی کا نقشہ کھینچنے کے برعکس، پہاڑ اور راستے کی جدلیات سے نئے معنی کا امکان ابھارتا ہے۔ سب اشعار میں کائنات کو تناظر بنایا گیا ہے، اور اس کے مقابل، روبرو، درمیان اپنے اثبات کی سعی کی گئی ہے۔ یہاں متکلم اور شاعر کو آپس میں گڈمڈ نہیں کیا جانا چاہیے۔ متکلم ایک لسانی کنونشن ہے، جب کہ اس کا موقف شاعر کی نمائندگی کرتا ہے۔ کسی شاعر کے یہاں اگر متکلم ہو مگر وہ دنیا، ذات، سماج کے سلسلے میں کسی پوزیشن کا حامل نہ ہو تو، اس کا صاف سیدھا مطلب یہ ہے کہ وہ شاعر نقال ہے۔

شعر میں جمال و نشاط کی کیفیتوں کے بعد اگر کوئی شے توجہ طلب ہوتی ہے، تو دنیا و کائنات کے سلسلے میں شاعر کی پوزیشن ہے۔ اس کی ساری نکتہ آفرینی، مضامینِ نو کی تلاش، اپنی نظر کو پیدا کرنے، اور اس نظر کے دنیا پر سایہ کرنے کی مرہون ہے۔ احمد حسین مجاہد کے یہاں اپنی نظر کے کرشموں کی کوئی کمی نہیں۔

ناصر عباس نیر
شعبہ اردو، پنجاب
یونیورسٹی لاہور

تُو غنی ہے دو جہاں سے، میں فقیرِ رہگذار
روزِ محشر لاج رکھ لینا مری پروردگار
پھر بھی جو لازم ہو میرے دفترِ عصیاں کی جانچ
مصطفیؐ کے سامنے کرنا نہ مجھ کو شرمسار

(فارسی سے ترجمہ)



اے میرے خدا!

اَزَل کے حجلہ ٔ تاریک میں چراغ جلے
جو التوا میں ہیں وُہ ساعتیں بھی آئینہ ہَوں
عروسِ وقت کے چہرے سے اَب نقاب اُٹھا
ورائے حدِ بیاں ! مجھ پہ منکشف ہَو جا

دیے کی لَو مرے سائے میں چھید کرتی ہے
صدائیں گونجتی ہیں زخم کے چٹکنے کی
سکوتِ شَب میں گلے مل رہے ہیں ارض و سما
ورائے حدِ بیاں ! مجھ پہ منکشف ہَو جا



ہَوائے صبح کے چہرے پہ خاک اُڑتی ہے
عذابِ دَر بدَری جانے اَب کہاں لے جائے
سوادِ دشتِ تحیر میں کوئی پھول کھلا
ورائے حدِ بیاں ! مجھ پہ منکشف ہَو جا

گندھی پڑی ہے بہت آگ اور بہت مٹی
کئی زمانے ابھی چاک پر نہیں آئے
صدائے کُن فیکوں آ رہی ہے صبح و مسا
ورائے حدِ بیاں ! مجھ پہ منکشف ہَو جا



نعت

محفلِ نعت میں آیا ہُوں میں اِس مان کے ساتھ
مجھ پہ آقاؐ کی نظر ہے بڑے احسان کے ساتھ

نُور اُترا تو ہوئی نُور کی تجسیم بھی خوب
شانِ تفہیم ہے قرآن کی قرآن کے ساتھ

یونہی یثرب سے نہیں بنتا مدینہ کوئی شہر
عدل کرتے تھے محمدؐ مگر احسان کے ساتھ



پاسِ منصب تھا کہ لوٹ آئے تھے افلاک سے آپ
بخدا میں تو نہ آتا کسی عنوان کے ساتھ

اُن کی نسبت کا حوالہ ہی مجھے کافی ہے
کیا کرے آگ مری خاکِ پشیمان کے ساتھ

میرا ہر سانس ہو بوصیریؒ کا مصرع احمد
روزِ محشر وُہ بلائیں مجھے حسانؓ کے ساتھ

جب چشمۂ تخلیق اُبل جاتا ہے
وجدان کہیں دُور نکل جاتا ہے
اُنگلی پہ مری گھومنے لگتی ہے زمیں
سورج مری مٹھی میں پگھل جاتا ہے

دیکھے گا میرے دیکھے ہُوئے خواب سارا شہر
کس کس کے غم کو میں نے اُجالا نہیں دیا
میں جانتا تو تھا کہ بڑا آدمی ہُوں میں
لیکن کسی کو اپنا حوالہ نہیں دیا

وقت کی رَفتار ہَو جاؤں گا میں
اتنا پُر اَسرار ہَو جاؤں گا میں

جیسے میرا خواب ہے یہ زندگی
جیسے اَب بیدار ہَو جاؤں گا میں

بے نیازانہ گزر جائے گا تُو
گاؤں کا بازار ہَو جاؤں گا میں

دیر سے چشمِ شفق آسا میں تھا
اَب سَرِ رُخسار ہَو جاؤں گا میں

دیکھنا ! ڈھونڈے گی جب منزل مجھے
راہ کی دیوار ہَو جاؤں گا میں

جان کر رکھی ہوئی ہے طبع خام
جو کہے گا یار ہو جاؤں گا میں

تُجھ حُسن سے معاملہ کس آن میں ہُوا
میں تو جواں ہی میر کے دیوان میں ہُوا

میری متاعِ اوّل و آخر ہے میرا عشق
وُہ عشق جو کہ عشق کے اِمکان میں ہُوا

سَر پَر بنا لیا ہے پرندے نے گھونسلہ
غافل میں خود سے ایسا ترے دھیان میں ہُوا

اُس کو طرح ملی مرے فکر و شعور سے
جو فیصلہ بھی وقت کے ایواں میں ہُوا

میں دُکھ تھا کائنات کا، جب حد سے بڑھ گیا
میرا ظُہور صورتِ انسان میں ہُوا

ہُوں کہ جب تک ہے کسی نے معتبر رکھا ہُوا
ورنہ وُہ ہے باندھ کر رختِ سفر رکھا ہُوا

مجھ کو میرے سب شہیدوں کے تقدس کی قسم
ایک طعنہ ہے مجھے شانوں پہ سر رکھا ہُوا

میرے بوجھل پاؤں گھنگھرو باندھ کر ہلکے ہُوئے
سوچنے سے کیا نکلتا دِل میں ڈر رکھا ہُوا

اک نئی منزل کی دُھن میں دفعتاً سرکا لیا
اُس نے اپنا پاؤں میرے پاؤں پر رکھا ہُوا

تُو ہی دنیا کو سمجھ پروردۂ دنیا ہے تُو
میں یونہی اچھا ہُوں سب سے بے خبر رکھا ہُوا

گزر رہی ہے جو مجھ پر بتا کے لے آئے
کوئی نہیں ہے جو اُس کو منا کے لے آئے

گزارنی تھی کڑی شب سَو اُس گلی سے ہَم
چراغِ نقشِ کفِ پا اُٹھا کے لے آئے

مگر یہ ہَم تھے کہ لائے تھے اُس الاؤ سے آگ
وہاں سے راکھ تو اَب کوئی جا کے لے آئے

وُہ اپنی کارگزاری کی داد چاہتے ہیں
جو عاجزی میں قرینے رَیا کے لے آئے

بَس اِک دیے کے سوا گھر میں کچھ نہ تھا احمد
اُسے بھی سامنے ہَم خود ہَوا کے لے آئے

اُٹھ جاؤں گا میں لے کے ہُنر دَر بدَری کا
رہ جائے گا بَس نام ہی آشفتہ سری کا

میں اپنے لرزتے ہُوئے سائے کی لحد ہُوں
دَم آنکھوں میں اَٹکا ہے چراغِ سَحری کا

اِک مُشتِ گلِ کُوزہ سے آئی مجھے آواز
دعویٰ تو ہمیں بھی تھا بہت کوزہ گری کا

گو تاب نہیں سانس لیے جاتا ہُوں پھر بھی
رہ جائے بھرم کچھ تو تَری چارہ گری کا

افواہ کی صورت ہُوں اگر ہُوں بھی میں احمد
حاصل ہے یہی رنج مری بے خبری کا

پیوندِ رہگذر ہُوں، نشستِ غبار ہُوں
اے دوست ! میں سراپا ترا انتظار ہُوں

جاتی نہیں ہے میرے دریچے سے دُور چاپ
یعنی میں اپنے حسنِ گماں کا شکار ہُوں

نروان پا کے بھی نہ ہُوئی جستجو تمام
میں سخت مضطرب ہُوں، بہت بے قرار ہُوں

لیتے ہیں مجھ سے آئینے تربیتِ سُلُوک
میں بوریا نشین ہُوں، میں خاکسار ہُوں

خوش ہُوں کہ اپنے حق سے میں ہوتا ہُوں دست کش
مجھ سے تُو خوف کھا، میں بڑا ہوشیار ہُوں

کس کے مخبر ہیں عناصر، پسِ افلاک ہے کون
بھید یہ کھول دے، ایسا مرا ادراک ہے کون

خون کی اُگتے ہوئے سبزے سے آتی ہے مہک
یوں زرِ زخم لٹاتا یہ تہہِ خاک ہے کون

کسمپرسی کو مری دیتا ہے جو فقر کا نام
میرا غم خوار نہیں ہے تو یہ سفاک ہے کون

ایک پیوند لگی گدڑی ہے، کچھ غزلیں ہیں
ایسا ترکہ ہو تو پھر وارثِ املاک ہے کون

فلک بھی شاید کسی کی باتوں میں آ گیا ہے
مرا مقدر جبیں سے ہاتھوں میں آ گیا ہے
یہ تیرے غم کے بیاں کی ساعت ہے جانِ احمدؔ
بدن سے کھینچ کر لہو دواتوں میں آ گیا ہے

گم گشتہ ستاروں کا نخلستانِ تحیر میں وصال

ذرا غور سے
دودھیا کہکشاں کے کنارے پہ روشن
ستارے کو دیکھو!
جہاں یہ ستارا نظر آ رہا ہے
وہاں کچھ نہیں ہے
ستارا نہیں
اُس کا ماضی ہے یہ
ٹیڑھ کھائی ہُوئی روشنی
اب جو پہنچی ہے مجھ تک
اِک ایسے ستارے کی ہے
جو فلک پر ہزاروں برس پہلے موجود تھا

اَب نہیں ہے
کہیں بھی نہیں ہے

ذرا غور سے مجھ کو دیکھو!
جہاں میں تمہیں اَب نظر آ رہا ہُوں
وہاں کچھ نہیں
اپنا ماضی ہُوں میں
(روشنی بانٹنے والے مر کے بھی مرتے نہیں)
تُم نجانے کہاں کھو گئے ہَو؟
کہیں تُم بھی میری طرح ۔۔۔۔

ناجنس کا لمس

وُہ چلتی

تَو اُس کے دوپٹے پہ

کاڑھے ہُوئے پھول

اِک ایک کر کے فضا میں بکھرتے

نئی کونپلیں پھوٹتیں

پھول کھلتے

فضا میں بکھرتے

کوئی پھول جب اپنے ناجنس کا لمس پاتا

تَو شعلہ بھڑکتا

کہیں آئینوں سے

کہیں پانیوں سے

مچلتی ہُوئی راکھ اُڑتی
تماشائی سب دیکھتے
دیکھتے اور رستہ بدلتے
مگر میں۔۔۔!
مجھے اِن پُراَسرار پھولوں کی
مانوس خوشبو نے
کچھ ایسا پاگل کیا
میں فضاؤں میں اُڑتے ہُوئے پھول چننے لگا
پھول چنتا رہا
مجھ سے کیا پوچھتے ہَو کہانی مری
یہ مرے ہاتھ دیکھو۔۔!
مرے ہاتھ ایسے نہیں تھے۔۔۔۔!

ٹوٹی چوڑیاں

بہت کہتا ہُوں
آئندہ کبھی ایسا نہیں ہوگا
مگر پھر بھی
کوئی ٹوٹی ہُوئی چوڑی
کہیں سے مل ہی جاتی ہے
کبھی تکیے کے نیچے سے
کبھی بُک شیلف سے
جیبوں سے
البم سے
تَو پھر وُہ پوچھتی ہے
تُم سے ملنے کون آیا تھا

یہ کس کی چوڑیوں سے تُم
مِرے جیون کو گھائل کر رہے ہَو
کون ہے وُہ؟
میں اُسے کہتا ہُوں
آئندہ کبھی ایسا نہیں ہَو گا
مگر ٹوٹی ہُوئی یہ چوڑیاں۔۔۔!

GUILTY LOVE

دُعا کو ہاتھ اُٹھاؤں تو دل لرزتا ہے
رگوں میں دوڑتی وحشت بھی کانپ اُٹھتی ہے
یہ مرحلہ جو محبت میں ہے مجھے دَرپیش
اِک ابتلا ہے جو مجھ ناتواں پہ اتری ہے
کوئی رفیق ! کوئی راز داں !! کوئی ہمدرد !!!
مگر یہ خلقِ خدا کس کے کام آئی ہے
بَس اِک خُدا ہی مرا چارہ ساز ہے لیکن
خُدا سے کیسے کہوں ، بات ہی کچھ ایسی ہے

وُہ حُسن جس کے تقدس سے شرمسار تھا عشق
اَب اُس کی آنچ مرے دِل کو گُد گُداتی ہے

بدن سے آتی ہے بوئے گناہِ نا کردہ
اِک آگ سی مرے سینے میں لہلہاتی ہے
مجھے خُود اپنے خیالوں سے خوف آتا ہے
خُود اپنے ڈَر سے مری سانس پھول جاتی ہے
بَس ایک بار دَھڑکتا ہے بے طرح مرا دِل
اور اُس کے بعد مری نبض ڈوب جاتی ہے

گناہ کر نہیں سکتا ، گناہ سوچتا ہُوں
میں کیا کروں مری اوقات ہی کچھ ایسی ہے
دُعا کو ہاتھ اُٹھاؤں تو دِل لرزتا ہے
خُدا سے کیسے کہوں بات ہی کچھ ایسی ہے

پہاڑ پر مجھے رستہ دکھائی دیتا ہے
کئی دنوں سے وُہ تنہا دکھائی دیتا ہے

اتارتا ہُوں میں تصویر اُس کی لفظوں میں
مجھے خیال کا چہرہ دکھائی دیتا ہے

فرازِ کوہ سے جب دیکھتا ہُوں بستی کو
تَو اُس کا گھر بھی قفس سا دکھائی دیتا ہے

یہ کس دیار کی مٹی مرے خمیر میں ہے
کہ جسم ، روح سے ہلکا دکھائی دیتا ہے

زباں سمجھتا ہُوں میں ٹوٹتے ستاروں کی
یہ شہر مجھ کو اُجڑتا دکھائی دیتا ہے

برہنہ پیڑ کی شاخوں پہ چاند اُترا ہے
مجھے یہ وقت دُعا کا دکھائی دیتا ہے

اپنی بے مائیگی چھپاتا ہُوں
تیرے سائے میں بیٹھ جاتا ہُوں

یاد کرتا ہُوں اِس قدر تجھ کو
میں تری شکل بھول جاتا ہُوں

تُو نے پامال کر کے عزت دی
دیکھ! میں کیسا لہلہاتا ہُوں

سر اٹھاتا نہیں میں زانو سے
کیا تعلق ہے جو نبھاتا ہُوں

فصل کاٹیں گے کاٹنے والے
میں تَو بس بور ہی اٹھاتا ہُوں

ہائے! یہ رازِ رائگانیِ عشق
ہائے! میں تجھ سے کیا چھپاتا ہُوں

دائم آباد محفلِ یاراں
میں ابھی گھر سے ہَو کے آتا ہُوں

اگرچہ یہ مری کوشش کی انتہا بھی نہ تھی
وہاں چراغ جلایا جہاں ہَوا بھی نہ تھی

سبھی سے اُس نے بگاڑی ہُوئی تھی میرے لیے
وُہ میرے عشق میں حالانکہ مبتلا بھی نہ تھی

مجھے یہ دُکھ ہے کہ جب اُس کے سامنے مجھ کو
کسی نے بوسہ دیا تھا تَو وُہ خفا بھی نہ تھی

تُو میرے ساتھ ہے اَب بھی تَو مہربانی تری
مری گرہ میں تَو ورنہ کوئی دُعا بھی نہ تھی

مجھے اُتارا گیا تھا اِک ایسی بستی میں
جو مجھ سے پہلے محبت سے آشنا بھی نہ تھی

سرِ آئینۂ ہر ذرۂ صحرا چمکتا ہے
تری پلکوں کا سایہ سا سراب آسا چمکتا ہے

جھٹک کر ڈالتی ہے جب وُہ بھیگے بال شانے پر
تَو نیچے دُور وادی میں کہیں دریا چمکتا ہے

کسی نے آگ میں گوندھا ہے برسوں میری مٹّی کو
بدن کے ریشے ریشے میں اِک آئینہ چمکتا ہے

یہاں سے کوئی گزرا ہے یقیناً مجھ سے پہلے بھی
درِ امکاں پہ اَب بھی شبنمی بوسہ چمکتا ہے

جب آنکھیں خاک ہَو جاتی ہیں احمد تَب کہیں جا کر
بَس اِک پَل موجۂ خوشبو کا نقشِ پا چمکتا ہے

سَب سے اَلگ تھا، سَب سے جُدا تھا مری طرح
اچھا تھا وُہ بہت سو بُرا تھا مری طرح

اُس کے بدن سے جاتی نہیں اَجنبی مہک
دُشمن سے ٹُوٹ کر وُہ ملا تھا مری طرح

اِک شخص تھا جو اُس پہ چھڑکتا تھا اپنی جان
اُس شخص سے بھی اُس کو گلہ تھا مری طرح

چھت پر چڑھا تھا ڈوبتے سورج کو تھامنے
پھر اپنی آگ میں وُہ جلا تھا مری طرح

چہرے پہ اُس کے نُور تھا، صبحِ اَزَل کا نُور
اَندر سے وُہ بھی ٹُوٹا ہُوا تھا مری طرح

میری طرح اگرچہ وُہ خود رو نہ تھا مگر
احمد وُہ پتھروں میں ِکھلا تھا مری طرح

اپنی تخلیق سے کچھ داد ہی پائی ہَوتی
صفحۂ خاک پہ تصویر بنائی ہَوتی

میں مسافر تھا طلب کرتا اگر آبِ حیات
اوک میں بھر کے مجھے آگ پلائی ہَوتی

چار سُو بکھری یہ آیات تلاوت کرتا
دشت و کہسار کے مکتب میں پڑھائی ہَوتی

لے گیا کوئی رسالت ، کوئی اعجازِ ہُنر
میں نے اے کاش ! اگر آگ ہی لائی ہَوتی

جُز ترے اور کو میں دِل میں جو آنے دیتا
اُس نے اِس دَشت میں دیوار اُٹھائی ہَوتی

میں کسی گُم شدہ دریا پہ کھڑا ہُوں احمد
موج ورنہ مرے سَر تک کوئی آئی ہَوتی

دِل ہے تَو عشق کے آزار میں کام آئے گا
ورنہ ہمسائے کی دیوار میں کام آئے گا

اُس نے یہ کہہ کے مجھے میری غزل لوٹا دی
یہ قصیدہ تمھیں دربار میں کام آئے گا

میں وُہ بزدل ہُوں جو ظالم کی حمایت میں اُٹھا
اب مرا سر کسی مینار میں کام آئے گا

کام آئی تھی مرے، دشت میں وحشت میری
یار ہنگامۂ بازار میں کام آئے گا

اک دِیا ہے جو پسِ چشم فروزاں ہے کہیں
یہ دِیا کل تری سرکار میں کام آئے گا

کوئی خواب میرے وجود میں کہیں ریزہ ریزہ بکھر گیا
مرے ہاتھ کچھ نہ لگا مگر مرے سَر سے بوجھ اُتر گیا

وہی پاؤں چومے تھے جو کبھی میں نے اضطرابِ وصال میں
وہی پاؤں جاتے ہُوئے کوئی مرے دِل پہ رکھ کے گزر گیا

نہ سہی اگر وُہ مرا نہیں ، کسی اور کا بھی نہیں ہُوا
چلو اُس کی بات بھی رہ گئی، چلو میرا زخم بھی بھر گیا

یہ جو بوئے خوش مرے ساتھ ہے، کسی معجزے کا ہِرَاس ہے
وُہ قریب تھا مرے اِس قدر کہ میں اپنے آپ سے ڈر گیا

مجھے لینا دینا تَو کچھ نہ تھا، مری بے کلی یونہی رات کو
مجھے اُس گلی میں جو لے گئی، میں گلی سے ہَو کے گزر گیا

ایھا الناس...!

خدا نہیں آ رہا

پھر اِک دن اِس غبار آلود رستے سے
کوئی درویش آئے گا
وُہ بستی کے کناروں پر کھڑی
خلقِ خدا کو گودڑی میں بھر کے
بستی کے چوراہے میں انڈیلے گا
دلوں کو چیرتا بے نُور سناٹا
پھٹی آنکھوں سے اُس کی سمت دیکھے گا
فضا میں جا چُکے اُن قافلوں کی گرد ہَو گی
جن کا کارِ منصبی ایسے گئے گزرے علاقوں میں

کہیں خیمے، کہیں گندم، کہیں کمبل
کہیں بے حوصلوں میں حوصلہ تقسیم کرنا ہے
مگر کب تک؟
کہ اَب خلقِ خُدا اِک بار پھر
اپنے خُدا کی منتظر ہے
دوسرے دیسوں سے آئے قافلے
کب تک بروئے کار آئیں گے؟
چٹختی پسلیوں کے روزنوں سے
بھوک باہر جھانکتی ہَو گی
کئی اِک ڈولتے پنجر
سرک کر گودڑی کے سائے میں
درویش کے پیروں سے لگ کر پوچھتے ہَوں گے
خُدا کب آئے گا؟
صدیوں سے ہَم اپنے خُدا کی راہ تکتے ہیں
تَو پھر درویش لاٹھی کے سہارے
اُٹھ کھڑا ہَو گا۔۔۔

چوتھا دَرویش

چوتھا دَرویش میں ہُوں اور مجھ کو
مجھ پہ بیتی ہے جو وُہ یاد نہیں

چاروں جانب شکستہ دیواریں
جن پہ ہَم اَجنبی رَفیقوں کے
بے خدوخال سائے رَقصاں ہیں
بیچ میں اِک اَلاؤ روشن ہے
جس کا ایندھن ہے یہ سسکتی رات
سَب کہانی سنا چکے اپنی
اَب مجھے داستاں سنانی ہے
داستاں، اَب جو مجھ کو یاد نہیں

دریا

کس کو معلوم تھا
کس نے سوچا تھا
اتنے سرابوں سے ہَو کر گزرتے ہُوئے
ایک دریا بھی رستے میں آجائے گا
ایک دریا۔۔۔!
جو اپنے کناروں سے
باہر بھی موجود ہے۔

کُدال

کہیں سے کوئی کدال لاؤ
ہمارے خوابوں کے درمیاں جو
یہ برف کا اک پہاڑ حائل ہے
اِس کو کاٹو
تمھیں خبر ہے
کہ میں محبت سے سوچتا ہُوں
مگر محبت سے کیسے کوئی پہاڑ کاٹے
کہیں سے کوئی کدال لاؤ۔۔۔!

ہم آسمان سر پہ اٹھائے ہوئے تو ہیں
جائیں کہاں، زمین پہ آئے ہوئے تو ہیں

گملے ہیں سیڑھیوں پہ، دریچے پہ بیل ہے
چھوٹا ہے گھر، ہم اِس کو سجائے ہوئے تو ہیں

کرتے ہیں عشق ایک تغافل شعار سے
ہم برف میں کچھ آگ ملائے ہوئے تو ہیں

اَب اور اُن سے چاہیے کیا میرے دِل تجھے
برباد کر کے دیکھنے آئے ہوئے تو ہیں

دَشت تھا، دھوپ تھی، وُہ یاد بھی آیا ہُوا تھا
ایسی وحشت تھی کہ میں اَنت مچایا ہُوا تھا

خواب، مٹی کا دِیا، نام، مقام اور کلام
اُس کے قدموں میں رکھا جو بھی کمایا ہُوا تھا

میری ناکام محبت تھی وُہ لیکن اُس نے
مجھ کو مرنے سے بہر حال بچایا ہُوا تھا

چُپ لگی ایسی کہ پوچھا بھی تَو بولا نہ گیا
میں نے پہلے تَو بہت شور مچایا تھا

کچھ تَو اظہارِ محبت بھی مرا سَر سَری تھا
کچھ وُہ بے درد بھی اِنکار پہ آیا ہُوا تھا

اُس نے کچھ ایسی نگاہوں سے مجھے دیکھا تھا
میرا سایہ بھی پسینے میں نہایا ہُوا تھا

مجھ سے لپٹا تو مری پُشت سے احمد اُس نے
میرے دُشمن کی طرف ہاتھ بڑھایا ہُوا تھا

ہَم اور آپ تَو ہیں دَشتِ نینوا میں ابھی
کہ خیمہ زَن ہے عدو اَرضِ انبیا میں ابھی

وُہ پھر رہا ہے کسی اور ہی ہَوا میں ابھی
مری شگفت کے موسم ہیں التوا میں ابھی

کسی نے رَکھ بھی دیے آ کے میری آنکھوں پہ ہاتھ
اور ایک میں ہُوں کہ مشغول ہُوں دُعا میں ابھی

سراغ پائے گا میرا وُہ میری موت کے بعد
بھٹک رہی ہے مری روشنی خلا میں ابھی

کل اپنے اپنے ترازو میں پائیں گے ہم لوگ
وُہ لفظ اپنے جو محفوظ ہیں فضا میں ابھی

یہ معجزہ کبھی ہَو گا یقیں نہ تھا مجھ کو
غزل وسیلہ ہُوئی نظمِ ذات کا مجھ کو

حرام کر دیا جینا اُس اک نگہ نے مرا
پلٹ کے کاش وُہ ایسے نہ دیکھتا مجھ کو

میں تنگ آ کے جو آغوشِ طاق سے نکلا
ہَوا نے بھی تہہ ِ داماں چھپا لیا مجھ کو

خُدا نے لاج رکھی ماں کے ایک آنسو کی
ملا تو گھر میں ملا چشمۂ بقا مجھ کو

پہاڑ اپنی جگہ سے سرک گیا احمد
پہاڑ پر نظر آیا تھا راستہ مجھ کو

یہ دُھواں آگ کا غماز بھی ہَو سکتا ہے
عشق اِنکار سے آغاز بھی ہَو سکتا ہے

یہ جو کھلتے ہی چلے جاتے ہیں مجھ پَر اَسرار
ہَم نَفَس! یہ تَو کوئی راز بھی ہَو سکتا ہے

نظمِ فطرت میں یہ بیکار تجسس میرا
کسی لمحے خَلَل اَنداز بھی ہَو سکتا ہے

باندھ لاتا ہُوں گرہ میں کبھی آنسو کبھی خواب
میرا تحفہ نظر انداز بھی ہَو سکتا ہے

یہ مرا طُورِ تحیر ، مرا محمود سکوت
کسی منصب پہ سرافراز بھی ہَو سکتا ہے

تلوار عدو کی تھک گئی ہے
پھر فصل سَروں کی پک گئی ہے

اَب زہر ملے تو وُہ بھی پی لوں
تالو سے زباں چپک گئی ہے

بے درد! طلوع ہَو کہیں سے
اَب آگ بہت بھڑک گئی ہے

موسم ہے مری نمو کا شاید
پلکوں پہ نمی چٹک گئی ہے

اِک بار تو یوں لگا کہ جیسے
پھولوں سے زمین ڈھک گئی ہے

چاہے جانے کی ہَوس دِل سے نکل پائی نہیں
میں ابھی شائستۂ آدابِ تنہائی نہیں

کن ستاروں کے دکھائے ہیں ہَوا نے سبز باغ
گردِ پا کو مسندِ سَر بھی پسند آئی نہیں

کھڑکیوں میں کیا بھنور پڑتے ہیں میرے نام پر
کون کافر ہے مری جس سے شناسائی نہیں

عمر بھر خود کو کیا کارِ محبت میں خراب
میں محبت سے ، محبت مجھ سے اُکتائی نہیں

اَشکِ خوں کی سیرِ مژگاں سے ہے احمد آبرو
ورنہ میرا عشق تَو محتاجِ رُسوائی نہیں

آئی بہار ، آ کے گزر بھی گئی مگر
میں کھوکھلے درخت سے لپٹا کھڑا رہا
اُس کے حضور گٹھڑی دکھوں کی بکھیر دی
اور وصل کا سوال گرہ میں پڑا رہا

وُہ کون تھی

اُس رات
ایڑی پر بھنور میں گھومتی موجوں کے تیور
دیدنی تھے
چودھویں کا چاند وسطِ آسماں میں
عین دریا پر معلّق تھا
قریب و دُور سے بے شکل آوازیں
سنائی دے رہی تھیں
وُہ مجھے ایسے میں دریا کے کنارے
اِک شکستہ ناؤ میں
بیٹھی نظر آئی تھی
میں آگے بڑھا تو میں نے دیکھا

اُس کی آنکھوں میں
بجائے پتلیوں کے آگ روشن تھی
نجانے کون تھی وُہ
اُس کے دیکھے سے
مری آنکھیں کُھلی ہی سِل گئی تھیں
ہونٹ پتھر ہَو گئے تھے
میں جو سنبھلا تو
نہ کشتی تھی نہ وُہ تھی
ایک خوشبو تھی کہ جس میں
سارا بَن لپٹا ہُوا تھا
جانیے وُہ کون تھی۔۔۔۔!

THE KISS

دُھند بہتی ہُوئی
برف کے کھو کھلے غار میں آ گئی تھی
پگھلتی ہُوئی برف کی چھت کے نیچے
طلسمی اُجالے کی دیوار کی اَوٹ میں
ایک لمحے کو
بَس ایک لمحے کو
دُنیا مرے پاؤں میں آ گئی تھی
مجھے اُس نے بوسہ دیا تھا
تحیّر زدہ، میں جہاں تھا وہیں جَم گیا
مجھ سے آہستہ آہستہ وُہ دُور ہَوتی رہی
برف گرتی رہی
دُھند بڑھتی رہی

(2)

دَشتِ غربت کا باسی ہُوں میں
میں تہی دَست ہُوں
مضمحل ہیں قُوَیٰ
جسم کے ریشے ریشے میں
بے اعتدالی نے گھر کرلیا ہے
کبھی ٹھیک سے دِل دھڑکتا نہیں ہے
ہَدَف پر کبھی ہاتھ پڑتا نہیں ہے
کبھی ضعف سے پاؤں اٹھتے نہیں
پاؤں اٹھتے ہیں تو سمت کا مجھ کو
ادراک ہَوتا نہیں
زندگی نے مجھے ایسے برتا ہے
میں جل رہا ہُوں
مگر راکھ ہَوتا نہیں
کچھ نہیں ہے مرے پاس کچھ بھی نہیں
ہاں مگر۔۔۔
ایک بار اُس نے بوسہ دیا تھا مجھے۔

برف الاؤ

کئی موسم
کئی بے زار موسم
سعیِ لاحاصل میں بیتے تھے
وُہ کھلتا ہی نہیں تھا
جانیے کس برف نے
وُہ بے طرح جلتا الاؤ ڈھانپ رکھا تھا
مجھے تَو خوف آتا تھا
کہ میں نے اِس سے پہلے اِس طرح کا آدمی
دیکھا نہیں تھا
یا تَو میں نے برف دیکھی تھی
بس اپنی آنچ کی شیدا

بس اپنے آپ میں گم برف۔۔!
یا پھر آگ دیکھی تھی
کہ جس کے اَن گنت اہداف تھے
سب مبتلائے زعمِ یکتائی
سبھی اک دوسرے سے بے خبر
اِس آگ میں چُپ چاپ جلتے تھے
مگر وُہ۔۔۔!
امتزاجِ برف و آتش
مجھ پہ جو کھلتا نہیں تھا
پھر مرے اتنا قریب آیا کہ میں نے بارہا
اُس کے بدن کی برف شاخوں پر
کھلے پھولوں سے اپنے لب جلائے ہیں
مری آنکھوں پہ اُس کے برف ہونٹوں میں
بھڑکتی آگ کا دلدار سایہ ہے
مجھے اس شخص نے
یہ کس طرح کی آگ کا ایندھن بنایا ہے۔

مرے بابا نہیں ہیں ناں!

مرے بابا نہیں ہیں ناں!
میں تپتی دوپہر میں
شہر کی سڑکوں پہ اپنے جسم کا
ایندھن جلاتا ہوں
تو گھر میں چولہا جلتا ہے
مرے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے ہیں
پاؤں سے چپکی ہوئی یہ تارکولی ریت
میرے ساتھ روزانہ
مرے بستر میں جاتی ہے
مجھے اپنے بدن سے
شہر کی روندی ہوئی سڑکوں کی
میلی باس آتی ہے
مرے بابا نہیں ہیں ناں۔۔۔!

موسم اچھا ہے مگر اِس سے مجھے کیا لینا
آج اِن رسمی سوالات سے باہر نکلو
تُم سے کرنی ہے کوئی بات ضروری مجھ کو
دو گھڑی رنجِ ملاقات سے باہر نکلو

اتنی مہلت مجھے عطا ہَو جائے
میری کوشش کی انتہا ہَو جائے

اُس کی تصویر سے مخاطب ہُوں
کیا خبر کوئی معجزہ ہَو جائے

اَب میں ایسے مقام پر ہُوں جہاں
سانس لینا بھی واقعہ ہَو جائے

یہ بھی ممکن ہے جس کو تُو چاہے
وُہ بھی اِک اور شخص کا ہَو جائے

اِس گلی میں پھر آنا ہَو کہ نہیں
جاتے جاتے بَس اِک صدا ہَو جائے

اے خُدا! کیا بعید ہے تجھ سے
وُہ مرے غَم میں مبتلا ہَو جائے

رنگِ بہارِ حسنِ گزشتہ نہ دیکھ پائے
اَب کے تَو ہَم نے اُس کو جو دیکھا، نہ دیکھ پائے

بادل تھے وُہ کہ گہرے گھنے پانیوں کی گرد
برسے تَو ہَم کچھ اپنے علاوہ نہ دیکھ پائے

ہَوتا رہا تماشہ کہیں آس پاس ہی
ہَم تجھ میں ایسے محو تھے، میلہ نہ دیکھ پائے

گو ہَم تھے مثلِ نقشِ کفِ پا سراپا چشم
اِس دِل کی تُجھ کو خاک اُڑاتا نہ دیکھ پائے

ایسی ہَوا سے خاک مَرَاسِم بڑھایئے
بچے کے ہاتھ میں جو غبارہ نہ دیکھ پائے

دیکھے ہیں اپنے کام سنورتے ہُوئے وَلے
احمد، خُدا سے ماں کو جھگڑتا نہ دیکھ پائے

طلسمِ ورطۂ فقر و غِنا بھی وَہم نہ ہَو
مرے خُدا ! مرا حرفِ دُعا بھی وَہم نہ ہَو

میں اپنی مَشک بھروں اور نگر نگر گھوموں
مگر یہ چشمۂ آبِ بقا بھی وَہم نہ ہَو

میں خود ہی کچھ نہیں، میرا سوال کیا شے ہے
مرے سخی! ترا زعمِ عطا بھی وَہم نہ ہَو

میں چاہتا ہُوں اُسے چُھو کے دیکھ لُوں اِک بار
یہ وہم ہے، وُہ سراپا اَدا بھی وَہم نہ ہَو

عروسِ وقت کا جلوہ تَو کس نے دیکھا ہے
مجھے یہ ڈَر ہے کہ احمد خَلا بھی وَہم نہ ہَو

رَاکھ ہَوتے دِل میں روشَن ایسی چنگاری ہُوئی
دیر تک تَو سانس لینے میں بھی دُشواری ہُوئی

میں نے سَب پیرائے عرضِ حال کے برتے مگر
اَن کہی باتوں کی گٹھڑی دَم بَدَم بھاری ہُوئی

رات مرجھائے ہُوئے تاروں کا گلدستہ لیے
صبح کے حجرے میں اُتری ہے تھکی ہاری ہُوئی

یہ سحر خیزی دِلِ بیمار کے ہَوتے ہُوئے
کس ہَوَس کی نَذر میری سَہل اَنگاری ہُوئی

کتنے فتنوں کے خِرامِ ناز میں ڈالا خَلل
ایک بَس تجھ پہ عیاں آنکھوں کی عیاری ہُوئی

ٹُوٹا جو یہ طلسم خدایا! توَ میں گیا
کرتا ہُوں جس کو یاد ، وُہ آیا ،توَ میں گیا

میں خود سپردگی میں ہُوں ایسے مقام پر
مجھ کو خیال اپنا بھی آیا توَ میں گیا

پیوندِ رہگذر ہُوں ، مرا اعتبار کیا
تُو نے مجھے زمیں سے اٹھایا توَ میں گیا

اُبھری جو کوئی چاپ تو سمجھو کہ میں نہیں
سرکا جگہ سے اپنی جو سایہ تو میں گیا

مجھ میں نہیں ہے تابِ سخن، حیرتی ہُوں میں
میں نے کسی کو یہ بھی بتایا تو میں گیا

وُہ اچھا جو مانگ لے دَر دَر سے خیرات
بیچا جس نے یار کو ، اُس کی کیا اوقات

پلٹ پلٹ کے مجھے دیکھتا تھا جاتے ہوئے
میں اُس سے روٹھ گیا تھا اُسے مناتے ہوئے

مجھے بھی دیکھتا ہے، دیکھتا ہُوں میں کہ نہیں
مرے عدو کو وُہ ظالم گلے لگاتے ہوئے

مجھے یہ برف پگھلتی نظر نہیں آتی
میں مر نہ جاؤں کہیں راستہ بناتے ہوئے

یونہی نہیں یہ پرندے فَضا میں ٹھہرے ہوئے
کسی کو دیکھ لیا ہو گا مسکراتے ہوئے

وُہ اُس کے عارَض ولب، وُہ خرامِ ناز اُس کا
گلاب کھلتے ہوئے، کھیت لہلہاتے ہوئے

فضا میں اُڑتی ہیں چنگاریاں، زمین پہ راکھ
میں اُس گلی سے نکلتا ہوں لڑکھڑاتے ہوئے

میں کیا کہوں کہ یہ کیسا شگون ہے احمد
وُہ یاد آیا ہے مجھ کو دِیا جلاتے ہوئے

ماں کہانی سناتی نہیں

مری ماں
کہ اینٹوں کے بھٹے میں مزدور ہے
اپنے پیروں تلے کی مسلسل بھڑکتی ہوئی آگ پر
تپتے سورج کے نیچے
اذیت سے دن کاٹتی ہے
میں چھوٹا سا تھا
جب مری ماں نے میرے لیے خواب دیکھا
وہ اک دن مجھے
(اپنی دانست میں)
اُس جہنم سے بہتر جگہ چھوڑ آئی

یہاں گاڑیوں کا دُھواں ہے
ہتھوڑے کی ضربیں ہیں
انجن کی آلائشیں ہیں
مری پیٹھ یہ ساری آلائشیں چوستے چوستے
نیلے پتھر کے مانند اکڑی ہوئی ہے
یہاں کی اک اپنی زباں
اپنی تہذیب ہے
میرے حصے کی سب گالیاں
اپنے پَلّو میں باندھے
مری ماں اندھیرے میں گھر لوٹتی ہے
نرک سے نرک تک کا یہ اک مسلسل سفر۔۔۔!
جسم دُکھتا ہے میرا
مجھے رات بھر نیند آتی نہیں
ماں کہانی سناتی نہیں

زندگی بھر کا مسافر

یہ برف باری اور ایک ناری ، چشمے سے پانی بھرے
خود کو سمیٹے آنچل میں اپنے ، آہٹ سے اپنی ڈرے

آنکھیں وہ گہری ، زلفیں سنہری ، وہ اُس کی مستانہ چال
ہونٹوں سے ٹپکے انگور کا رَس، اُس پر زمانہ مرے

کر کے اشارا ، مجھ کو دوبارہ ، اُٹھ کے چلی جائے وُہ
گڑیا کی شادی رہ جائے آدھی، الزام مجھ پر دھرے

بل کھاتے رستے، تنہا اکیلے ، پیڑوں کی لمبی قطار
منزل نہ پاؤں، چلتا ہی جاؤں، آنکھوں میں جگنو بھرے

دُکھ کا سفر ہو، دھندلی ڈگر ہو، ہو جائے رستے میں شام
ہمراہ کوئی ساتھی نہ سایہ ، دل کا کوئی کیا کرے

مڑ مڑ کے جھانکے نیچے گلی میں، کھڑکی میں رکھ کے دِیا
کوئی مسافر لُٹ جائے ہائے ، اُس کی گلی سے پرے

آٹھ اکتوبر 2005ء

پانی تھا میسر، نہ کفن تھا، نہ دعائیں
بے طور ہر اک پیر و جواں دفن کیا تھا
ملبے سے نکالے تھے کئی پھول کئی خواب
اب یاد نہیں کس کو کہاں دفن کیا تھا

کوئی مجھ کو خوشبو کی اوٹ سے بلاتا ہے
دُور ایک سرسوں کا کھیت لہلہاتا ہے

دِل دھڑکنے لگتا ہے اُنگلیوں کی پوروں میں
مرحلہ محبت میں ایسا بھی اک آتا ہے

چاپ سی ابھرتی ہے اور پھر ایک سناٹا
نیم وا دریچے میں آ کے بیٹھ جاتا ہے

کچھ پتہ نہیں چلتا کس طرح یہ غم احمدؔ
ہاتھ کی لکیروں میں راستہ بناتا ہے

خودرو تھا ، دلوں میں کھل گیا تھا
میرا بھی عجیب سلسلہ تھا

جب اُس نے چھوا، میں ایک پل میں
مٹی سے چراغ بن گیا تھا

کھڑکی پہ جھکی ہُوئی تھیں بیلیں
کمرے میں کوئی معاملہ تھا

پتھر میں دراڑ آ رہی تھی
یا مجھ سے کسی نے کچھ کہا تھا

وُہ اور کہیں سے آ رہی تھی
میں اور کہیں گیا ہوا تھا

پَسِ اُفق سہی لیکن کہیں اجالا ہے
ہماری فکر کا سُورج نکلنے والا ہے

جہاں جہاں ہے اَندھیرا مجھے وہاں سے گزار
یہ روشنی تو مرا دائمی حوالہ ہے

سِپُردِ آبِ رواں کر دیا تھا ماں نے مجھے
میں محترم ہُوں ، مجھے دشمنوں نے پالا ہے

عزیز ہے مجھے اپنی زبان کی لکنت
مرے کلام کا دُنیا میں بول بالا ہے

خُدا نے بخشا ہے مجھ کو سُکوتِ صبحِ اَزَل
میں جانتا ہُوں وگرنہ جو ہَونے والا ہے

مَن کو شانت کیا تھا، گھر مہکا رکھا تھا
بھولی بسری یاد نے اَنت مچا رکھا تھا

گاڑی مجھ کو جیسے چھو کر گزر گئی تھی
میں نے خود کو اور کہیں الجھا رکھا تھا

سانسوں کی تاریک گزرگاہوں سے آگے
اُس نے مجھ میں اپنا دیا جلا رکھا تھا

تیزی سے بہتے پانی پر گاڑ کے نظریں
ہَم دونوں نے پُل کو ناؤ بنا رکھا تھا

میں نے اُس کو موت کی آنکھ سے دیکھا ورنہ
وُہ اِک عام سا شخص تھا اُس میں کیا رکھا تھا

بیچ بھنور کے اُس نے اُتار دیا کشتی سے
میں نے رختِ سَفَر میں آئینہ رکھا تھا

آسمانوں سے فرشتہ تَو نہیں اُترے گا
شعر اُتریں گے، صحیفہ تَو نہیں اُترے گا

پار جانا ہے تو دریا میں اُترنا ہَو گا
سوچتے رہنے سے دریا تَو نہیں اُترے گا

بات بے بات نہ یاد آئے خدوخال سمیت
وُہ مرے دِل سے کچھ ایسا تَو نہیں اُترے گا

مکتبِ عشق سے تحصیلِ جُنوں کرتا ہُوں
میرے شانے سے یہ بستہ تَو نہیں اُترے گا

ہَو گئے صبح کے آثار ہُویدا بھی تو کیا
اِس قَفَس میں کوئی زینہ تَو نہیں اُترے گا

غَم کے اِظہار میں کیا چیز ہے مانع احمد
سَر ہی اُترے گا، یہ نَشہ تَو نہیں اُترے گا

خراب ہَوتے نہیں اُس کے ہاتھ مٹی سے
بناتی رہتی ہے وُہ زیورات مٹی سے

قلم پہ گرد ہے کچھ اَن کہے فسانوں کی
بھری ہُوئی ہے مری ہر دوات مٹی سے

بھلا گلاب سے نسبت ہی کیا ہے کانٹے کو
اُگے ہیں دونوں مگر ایک ساتھ مٹی سے

میں کھل اُٹھا تری سرگوشیوں کی رم جھم میں
ترے بَدَن کی مہک آئی رات مٹّی سے

میں اُس کو دیکھتا رہتا تھا خواب بُنتے ہوئے
بنایا کرتی تھی وہ کائنات مٹّی سے

مجھے یقین ہے کل میرے جیسا اور کوئی
سنا کرے گا یہی واقعات مٹّی سے

میں گھر سے دُور تھا، تنہا تھا، بے سہارا تھا
مجھے کسی نے بہت دُور سے پکارا تھا

بہت بھلی تھی وُہ شاخوں سے پھوٹتی ہُوئی لَو
شَجر کی اَوٹ میں شاید کوئی ستارا تھا

زمیں پہ اُترا جب انسان تو مرے رَب نے
کتاب بعد میں پہلے دیا اُتارا تھا

یہ خشک چشمہ، یہ ٹوٹے مکاں، یہ اُجڑا دیار
اِسی جگہ پہ کبھی گھونسلہ ہمارا تھا

نمازِ عصر پڑھی تھی مکاں کے ملبے پر
تلاوتِ غَمِ انساں میں دن گزارا تھا

میں عشق کرتا ہُوں اِعلان کے بغیر میاں
یہ نظم ہوتی ہے عنوان کے بغیر میاں

مجھے کچھ ایسا بھروسہ ہے اِس محبت پر
سفر پہ نکلا ہُوں سامان کے بغیر میاں

یہ رات ہجر کی آنکھوں میں کاٹ دی میں نے
طُلوعِ صبح کے امکان کے بغیر میاں

کلی نے میرے جنوں سے کیا تھا صرفِ نظر
قبائے گُل ہے گریبان کے بغیر میاں

تَو کیسے اُس سے میں انصاف کی امید رکھوں
وُہ عدل کرتا ہے اِحسان کے بغیر میاں

خزاں مہمان ہے شاید
ابھی اِمکان ہے! شاید!!

جھپکتا کیوں نہیں پلکیں
یہ بُت حیران ہے شاید

ابھی آنکھوں میں آنسو ہیں
دیے میں جان ہے شاید

سڑک پر میں اکیلا ہُوں
نگر ویران ہے شاید

جنوں ہو گا تو دیکھو گے
ابھی ہیجان ہے شاید

مجھے دیکھا تو فرمایا
یہ احمد خان ہے شاید

عالمِ بے خودی میں بھی مجھ سے وہی خطا ہوئی
جس پہ خدا تو خوش ہُوا، خلقِ خدا خفا ہوئی

پاؤں پکڑ لیے مرے قیس نے احترام سے
مکتبِ عشق سے مجھے ایسی سند عطا ہوئی

اجڑے ہوئے دیار کی، چُپ سے کشید ہو تو ہو
ورنہ وُہ شب کی نغمگی، عرصہ ہُوا ہوا ہوئی

جاتی ہُوئی بہار کا کھلتا ہُوا گلاب ہے
دشمنِ جاں کے واسطے مجھ سے نہ بد دعا ہُوئی

دیتے عجب لَو مرے زخمِ ہُنر اور بھی
تُو جو مجھے دیکھتا ایک نظر اور بھی

وقت کسی کا نہیں، دیکھ! مرے خوش گماں
تیری طرح تھے کئی رشکِ سحر اور بھی

چاپ ہَو یا دستکیں، سہل ہے اِن کا سُراغ
رات کے سینے میں ہیں راز مگر اور بھی

خالقِ کون و مکاں! زہر سہی زندگی
مہلتِ یک دو نفس چاہیے پَر اور بھی

تکوینِ کائنات

(دانشِ بابِ شہرِ علم کی روشنی میں)

کائنات اک اندھیری گپھا تھی
زماں بے جہت تھا
مکاں تیرہ وتار تھا، منتشر تھا
اندھیری گپھا میں
بہت دُور۔۔۔۔۔ نیچے
یہاں سے وہاں تک
ہَوا ہی ہوا تھی
ہوا کے سمندر پہ پانی
روانی سے نا آشنا

ایسے ٹھہرا ہُوا تھا کہ جیسے کوئی داستاں گو
کہانی سناتے ہوئے سانس لینے کو ٹھہرا ہُوا ہو
خموشی کے بے انت خلوت کدے میں
خدا نے بس اک حرفِ کُن کا اجالا کیا
بادِ ممنون پیغامِ تخلیق لے کے چلی
اس نے پانی کے اول کو آخر پہ، ظاہر کو باطن پہ پلٹا
چھلکتے ہوئے اولیں آبِ تاریک کو
اس ہوا نے کناروں سے اوپر دھکیلا
پھر اس کو کچھ ایسے مَتھا
جیسے دیہات میں عورتیں تنگ مشکیزۂ ماست کو۔۔۔۔
تہ بہ تہ ہو کے یہ آبِ تاریک
ایسا تلاطم میں آیا کہ اس کے کناروں پہ کف کے پہاڑ اُگ گئے
بادِ ممنون پیغامِ تخلیق لے کے چلی
اور بے انتہا کف اندھیری گپھا سے بلندی کی جانب اچھالا
خدا نے اسی کف سے سات آسمانوں کی تخلیق کی
آسمانِ زمیں کو ستاروں سے اس نے مزین کیا
اور پھر بادِ ممنون پیغامِ تخلیق لے کے
زمیں کی طرف چل پڑی۔

اپنے وجود میں دوسری ترمیم

میں بھی کیا تھا
کہ چہرے پہ بوسیدہ افکار کے ڈھیر سے
ملنے والی وُہ آنکھیں سجالی تھیں میں نے
جن آنکھوں کی اپنی لُغَت تھی
لُغَت خیر کیا تھی
سرے سے کسی چیز کے کوئی معنی سمجھ میں نہیں آرہے تھے
مساجد کے مینار و گنبد
کلیساؤں کی گھنٹیاں
مندروں کی خموشی
سدھارتھ کے سینے سے نروان کا بہتا چشمہ

اساطیرِ کہنہ، روایاتِ گُم گشتہ، رشتوں کی تقدیس
سارے مظاہر سے، سارے علائم سے، سارے حقائق سے
مجھ کو وہی ایک بُو آ رہی تھی
جسے اپنی آنکھوں سے میں دیکھتا تھا
مرا ذہن بھی میری آنکھوں سے مرعوب تھا
دِل بھی سہما ہُوا تھا
بدن کے حوالوں سے سارے مظاہر کی تفہیم کے مشغلے کو
میں علمِ لَدُنی سمجھتا رہا
اے خدا! میرے بچے سلامت رہیں
اے خدا! سب کے بچے سلامت رہیں
جن کی سانسیں صحائف کی آیات ہیں
میں جسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا
اَب اِس کارخانۂ عالم کو
اک باپ کی آنکھ سے دیکھتا ہُوں۔

خوشامدی

جھاڑتا تھا میں آستیں اپنی
ڈھونڈتا تھا میں کونوں کھدروں میں
سانپ جوتے میں چُھپ کے بیٹھا تھا

توجیہ

مریخ آ گیا تھا زمیں کے بہت قریب
وُہ اپنے گھر کی چھت پہ بڑی دیر تک رہی
میں بادلوں کی اوٹ سے تکتا رہا اُسے
وارفتگی میں وُہ بھی کھڑی دیر تک رہی

کھوئی ہُوئی تھی وسعتِ افلاک میں کہیں
آواز دی کسی نے تَو زینہ اُتر گئی
پھر وُہ تھی چھت پہ اور نہ مریخ تھا کہیں
یہ بزم تھوڑی دیر سجی اور بکھر گئی

ساتھ ہوتی ہے مگر ساتھ نہیں بھی ہوتی
ہَو بھی جاتی ہے ملاقات ، نہیں بھی ہوتی

شرم سے گاہے دَہک اُٹھتے ہیں اُس کے رُخسار
گاہے ترسیلِ خیالات نہیں بھی ہوتی

ہَو بھی آتا ہُوں میں افلاک سے بیٹھے بیٹھے
اِس طرح سیرِ سماوات نہیں بھی ہوتی

جلتا رہتا ہے دِیا ہاتھ میں، آنکھوں میں دماغ
حجرہ ٔ ہجر میں اَب رات نہیں بھی ہوتی

سب فقیروں کو نہیں ملتی نظر کی خیرات
ایسے کاموں میں مُساوات نہیں بھی ہوتی

چشمہ چشم سے بھر لاتا ہُوں میں اوک میں آگ
اِس سے توہین ِ خرابات نہیں بھی ہوتی

آنکھوں آنکھوں ہی میں ہَو جاتی ہیں باتیں احمد
بات کیا ہے کہ کوئی بات نہیں بھی ہوتی

رہا ہے ایک خلا سے مکالمہ میرا
کوئی گواہ نہیں وقت کے سِوا میرا

میں کوئی ایک نہیں ہُوں اگرچہ ایک ہُوں میں
اَزَل سے لے کے اَبد تک ہے سلسلہ میرا

پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اُڑتے تھے
سو دَب گیا کہیں ملبے میں حوصلہ میرا

میں بولتا نہیں ، بس دیکھتا ہُوں حیرت سے
کسی پہ کھلتا نہیں پھر بھی مُدّعا میرا

میں لُٹ گیا ہُوں خدا کے سِپُرد کر کے اُسے
وُہ جانتا ہے کہ مخبر نہیں خدا میرا

عجزِ بیاں کی قوسِ قزح ہاؤ ہُو میں ہے
دِل میں ہے جو ہَوس وُہ کہاں گفتگو میں ہے

ہونے لگے ہیں گردِ تحیر میں گُم نجُوم
اِک مشتِ خاک معرکہ ٔجستجو میں ہے

کر دے جو محو دِل سے مرے رنجِ رفتگاں
وُہ شے نہ میرے جام نہ تیرے سَبُو میں ہے

دوزخ سے ہَو کے آتی ہے جیسے لبوں پہ بات
احمد حسین رنج اک ایسا لہو میں ہے

سلسلہ ملنے ملانے کا رہا جاتا ہے
اَب اگر کوئی اِدھر آئے تَو آ جاتا ہے

میں سمجھتا تھا یہ اندازِ پذیرائی ہے
مجھ کو دیوانہ محبت سے کہا جاتا ہے

اوڑھ لیتا ہے خدوخال بھی گاہے گاہے
اک تصور مجھے تصویر بنا جاتا ہے

مجھ کو دنیا سے جس اَسرار نے بیگانہ کیا
لوگ کہتے ہیں اسے عشق کہا جاتا ہے

جنسِ بے مصرف و متروک ہُوں میں وُہ کہ جسے
قافلہ جاتے ہوئے آگ لگا جاتا ہے☆

تُو سمجھنا ہی نہیں چاہتا ، کیا سمجھاؤں
ناصحا ! دُکھ تو پہاڑوں کو بھی کھا جاتا ہے

☆لگا کے آگ جسے کارواں روانہ ہُوا۔۔۔(آتش)

بس ایک زخم تھا ہَم جس کو سِل سمجھتے رہے
ذرا سے دُکھ کو غمِ مستقل سمجھتے رہے

بہت خراب تھی دشتِ جنوں کی آب و ہَوا
ہَم اہلِ عشق اسے معتدل سمجھتے رہے

حجاب ہے ، سرِ آئنیہ ٔ بیاضِ جمال
ہَم اُس کے گال پہ جس شے کو تِل سمجھتے رہے

اٹھائے ہَم نے خدوخال اک تحیر کے
اُسی سے ،آپ جسے آب و ِگل سمجھتے رہے

بس ایک حسرت ِ برباد و ناتمام کو ہَم
کبھی دماغ ، کبھی اپنا دِل سمجھتے رہے

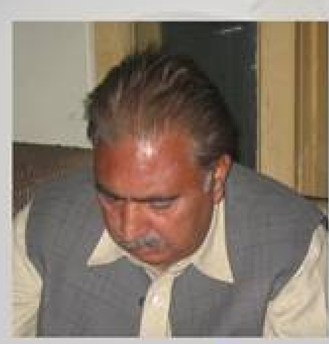
خدا سے کیسا گلہ اپنی بدگمانی کا
وُہ کارساز ہے ، اُس کو مخل سمجھتے رہے



نظم

احمد حسین مجاہد کے لیے

تمھاری کتابیں
دکھائی نہیں دے سکیں
اُن ادب کے وڈیروں کو جو
شاعروں کو رعایا سمجھتے رہے ہیں
کہ تم شاعری میں قصیدے نہیں لکھ سکے
ان محلات میں رکھے
سونے کے پنجروں کی
تم کیسے رونق بڑھاتے
کہ تم
وہ سنہری پروں والے طائر نہیں ہو
جو دربار سے منسلک ہو
وہ شاعر نہیں ہو
خوشامد کے فن میں بھی
ماہر نہیں ہو
ابھی اپنے قامت میں
ظاہر نہیں ہو



امتیاز الحق امتیاز

احمد حسین مجاہد قومی سطح پر اردو شاعری کا ایک اہم نام ہے۔ یوں تو اس نے نثر میں بھی اپنی دھاک بٹھائی ہوئی ہے لیکن اس کی اصل جولانگاہ شاعری ہی ہے۔ اس کی غزل گوئی پر مضامین کے لحاظ سے بھی بات ہو سکتی ہے اور اس پوشاک کے حوالے سے بھی جو وہ مضامین کو پہناتا ہے لیکن قصہ مختصر یہ ہے کہ اس کے اشعار مجموعی طور پر نگارِ غزل کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں! اس کی شاعری کے اجزائے ترکیبی ہی ایسے ہیں۔ نرمی میں گندھی ہوئی خوب صورت لفظیات، لفظوں کو ایک دوسرے سے جوڑنے والی ایسی بُنت جو کہکشاں کی طرح ستاروں کو باہم مربوط کر دے، لہجہ جس میں نقرئی کھنک ہے، تغزل جو مضامین اور الفاظ دونوں سے اتنا ہم آہنگ ہے کہ ہر حال میں بلند معیار برقرار رکھتا ہے اور پھر ان سب صفات کا وہ مجموعی تاثر ہے جو مجاہد کو سخن کے میدان میں قابلِ رشک اعتبار بخشتا ہے۔



دشت تھا، دھوپ تھی، وہ یاد بھی آیا ہوا تھا
ایسی وحشت تھی کہ میں انت مچایا ہوا تھا

ایسی وحشت لیلائے سخن ہر کسی کو نہیں عطا کرتی۔ یہ تو مقدر سے ملتی ہے! شاعری کے خوش نما چہرے پر پڑی ہوئی سحر آگیں زلف جس ناز و نیاز سے احمد حسین مجاہد اٹھاتا ہے اسی کا حصہ ہے۔

محمد اظہار الحق